دعوتی کام کی اہمیت اور اس کی حکمت عملی

مولانا سید محمد رابع ندوی

امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کو اپنے سے پہلے کی مسلمان امتوں پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ سابقہ امتوں میں انبیا علیہم السلام کے بھیجے جانے کا سلسلہ قائم تھا، اللہ تعالیٰ ایک نبی کے بعد دوسرا نبی بھیجتا تھا، جو دین صحیح کی دعوت کا کام کرتا تھا، ہر نبی کے امتی اپنے نبی کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے اور دعوت دین کے کام میں شرکت کرتے تھے، لیکن حضور مقبول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبیوں کا بھیجنا موقوف کیا گیا اور وہ کام جو پے در پے نبی بھیج کر کرایا جاتا تھا، چوں کہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آجانے سے دین مکمل ہوگیا اس کی رو سے آخری نبی کے لائے ہوئے آخری پیغام خداوندی کو قیامت تک جاری رہنا ہے، اس لیے اب جو کام ہونا تھا وہ اسی دین کے اندر ہونا تھا، لہٰذا اس کے لیے اب آپ کے بعد قیامت تک کی نیابت آپ کی امت کے سپرد کی گئی، قرآن مجید میں حکم آیا ہے: ﴿ولتکن منکم أمة یدعون إلی الخیر ویأمرون بالمعروف وینهون عن المنکر وأولئك هم المفلحون﴾. (آل عمران:104) (تم میں ضرور ایک امت یعنی ایک بڑی تعداد میں لوگ ہونے چاہئیں جو دعوت الی الحق کا کام کریں، اچھی بات کا حکم دیں، بری بات سے منع کریں اور یہی لوگ کام یاب ہوں گے۔)

اور فرمایا: ﴿کنتم خیر أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتؤمنون باللہ﴾. (آل عمران:110) (تم واقعتاً بہترین امت ہو، جو لوگوں یعنی سب انسانوں کے لیے بھیجی گئی ہے، تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔)

اس آیت میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس امت کو بہتر امت قرار دے کر دیگر انسانوں پر مقرر کیا گیا ہے اور اس کی بنا پر وہ کام جو اللہ تعالیٰ اپنے انبیا سے لیتا تھا اس کی انجام دہی اس امت کے سپرد کی ہے، پھر اس کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ تم یعنی اس امت کے افراد اللہ پر ایمان رکھتے ہو، یہ بات کہ تم بہترین امت اور تمام انسانوں کے لیے مامور کیے گئے ہو، اس سے ظاہر ہوا کہ اس امت کا بہترین یعنی بلند منصب رکھنے والی امت ہونا، پھر نبیوں سے لیے جانے والے کام کی انجام دہی اس کے سپرد کیا جانا، پھر ایمان کی صفت سے باقاعدہ متصف ہونا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے گئے ایمان ویقین سے آراستہ ہونا، یہ تین خاص پہلو ہیں، جن کو نمایاں طریقہ سے بیان فرمایا گیا ہے، یہ بلند منصب اور اہم کام کی انجام دہی کی ذمہ داری وہ اہم مقام اور کام ہے جو امت محمدیہ کے لیے دیگر امتوں کے مقابلہ میں تمغۂ امتیاز ہے، لیکن یہ اسی وقت صحیح اور مطابق واقع ہوگا جب مسلمان اپنی ذمہ داری کو پورا کریں، یہ ذمہ داری دینی دعوت کا کام

انجام دینے کی ہے اور الحمدللہ مسلمانوں کے ہر دور میں اور ہر ملک میں یہ کام کسی نہ کسی مقدار میں انجام دیا جاتا رہا ہے، بس فرق اگر کوئی ملتا ہے تو اس کی کمی بیشی کا۔ اور قرآنی اشاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کام میں کمی بیشی کی بنیاد پر امت کے فروغ وعزت میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے، البتہ چوں کہ اس امت کو تاریخ انسانی کی آخری اور معیاری امت قرار دیا گیا اسی لیے رب العالمین کی تابع داری کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے، اس امت کے ذریعہ ہی ہوا، صرف جگہیں اور قومیں بدلتی رہیں، ایک علاقہ اور ایک قوم کے لوگوں نے کوتاہی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق اس قوم سے لے کر دوسری قوم کو عطا فرمادی، عربوں کو توفیق ملی، ان کے بعد پھر ایرانیوں کو، ترکستانیوں کو، کردوں کو، منگولوں کو، بربروں کو اور پٹھانوں کو اور مصریوں کو نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے، بہر حال مختلف زمانوں میں ان میں سے کوئی نہ کوئی قوم اسلام کی شوکت وعظمت کے کام میں نمایاں اور پیش رو بنتی رہی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ بھی دکھادیا کہ ان کی عزت وعظمت دراصل اسلام کو تقویت پہنچانے اور اس کی خدمت سے وابستہ ہے، جو اس کو اس کے معیار کے مطابق اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو عظمت وبرتری عطا کرے گا، بصورت دیگر اللہ تعالیٰ اس کو ہٹا کر دوسروں سے یہ کام لے لے گا، چناں چہ اس کام کے طفیل میں کبھی دمشق کو عظمت ملی، کبھی بغداد کو، کبھی قرطبہ کو، کبھی قاہرہ کو، کبھی دہلی کو، پھر قوموں سے ہٹ کر افراد امت سے بھی خصوصی کام لیا گیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ، حضرت حسن بصریؒ، سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ جلال الدین رومیؒ، حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور اسی طرح متعدد عظیم شخصیتوں کی کوششوں نے دین کی دعوت اور اصلاح امت کے لیے جو خدمات انجام دیں، اس کے ذریعہ دین کو وہ تقویت ملی جس کی ضرورت تھی، چناں چہ دین اپنی صحیح حالت میں جاری ہے، البتہ اس کے لیے کام کرنے والوں کے کاموں میں جو کمی بیشی ہوتی رہی اس کی وجہ سے دین کی عظمت ووسعت میں کمی بیشی ہوتی رہی، اسی کا اثر یہ رہا کہ کبھی دین اور دین کے داعیوں کی عظمت بڑھی ہوئی نظر آئی اور کبھی اس کی عظمت میں کمی نظر آئی، لیکن یہ دین کم وبیش طریقہ سے برابر قائم ودائم رہا اور قائم ہے، جس قوم اور جن افراد کو دعوت وتقویت دین کی توفیق حاصل ہوئی ان کو اس کے طفیل عزت وبرتری ملتی رہی ہے اور جو کوتاہی کرتا رہا اس کو زوال اور پس ماندگی حاصل ہوتی رہی ہے، چناں چہ جب اور جہاں دعوت کا کام ڈھیلا پڑا اور کم ہوا یا متروک ہوا وہاں اسی کے اعتبار سے مسلمانوں کی عزت کا مقام کم ہوا اور جہاں توجہ وفکر کی گئی وہاں اس کی عظمت ووسعت میں اضافہ ہوا۔

اندلس جو ایک جنت ارضی کے مانند تھا اور جہاں مسلمانوں کی علمی ودعوتی ترقی اس معیار کو پہنچی تھی کہ اس وقت ساری دنیا اس کو دیکھ کر مرعوب ومتاثر تھی اور یورپ کی موجودہ علمی ومادّی ترقیات کا آغاز وہیں کی خوشہ چینی سے ہوا، جس کو تمام ماہرین تاریخ علم وتمدن مانتے ہیں، وہاں کے مسلمانوں نے سب کچھ کیا تھا، لیکن دعوتی فریضہ انجام دینے میں شاید کمی کی تھی اور وہ وہاں برابر چھوٹی ہی تعداد میں رہے اور جب اکثریت واقلیت کے اصول کے دائرہ اثر میں آئے تو اولاً مجبور ومقہور ہوئے، پھر بالآخر ملک سے ہجرت کرنا پڑی، لیکن برصغیر ہندوپاک میں اگرچہ اندلس ہی کی طرح مسلمانوں کی حکومت سات سو سال رہی اور یہاں حکمرانوں نے عوام کو اپنا ہم نوا بنانے کے لیے طرح طرح کے سیکولر طریقے بھی اختیار کیے، حتی کہ بعض بادشاہوں نے یہاں اکثریتی عوام کے مشرکانہ مذہب کی متعدد باتوں کو اسلام میں ملا

کرایک مشترک مذہب بھی بنایا، مزید یہ کہ یہاں کے اکثریتی مذہب کے اہم لوگوں میں خسر داماد کے رشتے بھی قائم کیے، لیکن اس کا نتیجہ غیروں کی طرف سے بجائے قدر دانی کے آج یہ ہے کہ خوب گالیاں مل رہی ہیں اور مسلمان بادشاہوں کو ہندوؤں پر ظلم وتعدی کا مرتکب بتایا جارہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہاں اندلس کے برعکس دین کے علم برداروں اور داعیوں نے اپنی اپنی جگہ ملک میں پھیل کر دنیاوی اور سیاسی منافع سے الگ رہتے ہوئے جم کر دعوت کا کام کیا، آج انہیں کی برکت ہے کہ اس برصغیر میں مسلمانوں کی اچھی پوزیشن ہے اور دینی علمی کام ہے اور انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ جب اس برصغیر میں باہر سے آنے والے مسلمانوں کی کل تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہیں بنتی لیکن اب ان کی تعداد اس برصغیر میں چالیس بیالیس کروڑ ہے، 13-14 کروڑ ہندوستان میں، 26-27 کروڑ پاکستان وبنگلہ دیش میں، یعنی باہر سے آنے والوں کو دیکھتے ہوئے ایک اور دس ہزار کا فرق رکھتی ہے، یعنی ایک آدمی اگر باہر سے آیا ہوا ہوگا تو 9999 یہیں اسی ملک کے ہیں، ان میں سے کچھ تو وہ ہوں گے جو باہر سے آنے والوں کی نسل سے ہیں، لیکن اکثر وبیشتر وہ لوگ ہیں جو اسلام کی محبت وانسانیت نوازی کی اداؤں کو دیکھ کر حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کی اولاد ہیں، دین کے علم برداروں اور داعیوں کی بے لوث کوششوں کے اثر سے آج اس برصغیر میں مسجدوں کی تعداد لاکھوں تک ہوچکی ہے اور مدرسے ومکاتب ہزاروں کی تعداد میں ہیں، جن سے علم دین کی شعاعیں قریب ودور پھیلتی رہی ہیں، حتی کہ ان کا فیض برصغیر سے نکل کر ایشیا کے وسطی شمالی ومشرقی ملکوں تک پہنچتا رہا ہے اور امت اسلامیہ کے علوم دینیہ وثقافیہ میں ان مسلمانوں کا جو وقیع حصہ ہے وہ بھی قابل فخر ہے، لہٰذا یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ دعوت کا کام مسلمانوں کا اصل امتیاز اور اہم ترین فریضہ ہے اور اس کام سے وابستگی سے ان کی بقاوترقی وابستہ ہے، اسی کے ساتھ ایمان کی وہ خصوصیات بھی ہونا ضروری ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے وہ مستحق ہوں، وہ عقیدہ کی بھی اور عملی بھی ہونے کی ضرورت ہے، یہ دونوں باتیں جس قدر رہوں گی، کامیابی اور سرخ روئی ملے گی اور جب اس میں کمی ہوگی، نقصان کا باعث ہوگی۔

دعوت کے کام میں جو اجر بتایا گیا وہ شاید ہی کسی اور عمل میں بتایا گیا ہوگا، دعوت کے نتیجہ میں جو کسی شخص کی اصلاح اور عمل صالح کو اختیار کرنے کی صورت پیدا ہوتی ہے اور عمل کرنے والے کو اس پر اجر وثواب ملتا ہے، اس کے بقدر دعوت دینے والے کو بھی ملتا ہے، اس مضمون کی کئی حدیثیں آئی ہیں، دعوت وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ایک آدمی صرف اپنے ہی عمل کے ثواب کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ ان تمام لوگوں کے ثواب کا بھی مستحق بن جاتا ہے جو اس کے کہنے اور متوجہ کرنے سے حق قبول کرنے والے اور عمل خیر کرنے والے بن گئے، وہ دو چار بھی ہوسکتے ہیں، سینکڑوں اور ہزاروں بھی ہوسکتے ہیں، اس طرح امت میں بعض حضرات کے ثواب کا اندازہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے، جن کی دعوت کے اثر سے ہزاروں اور لاکھوں کی اصلاح ہوئی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا ثواب حاصل ہورہا ہوگا، خود ان کے عمل کا ثواب اتنا زیادہ ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، پھر ساری امت کے اعمال کے ثواب کے برابر بطور مزید ان کو ملے گا، چوں کہ سب اصلاً ان ہی کی دعوت کا نتیجہ ہے۔

لیکن دعوت کا کام ایک طرف تو بڑے اجر وثواب کا کام ہے، دوسری طرف یہ کام بڑی دانائی، حکمت عملی اور نفس کشی کا کام بھی ہے، اس کام کے ساتھ خود اپنے کو بھی معیار صلاح واحتیاط پر رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے، کیوں کہ

بے عمل کی دعوت کا اثر مدعو پر بہت کم پڑتا ہے اور اسی طرح مدعو کے حالات ومزاج کو سامنے رکھتے ہوئے حکمت وموقع محل کا لحاظ کر کے بات کرنا ہوتی ہے، اس سلسلہ میں اپنی راحت وپسند کی قربانی بھی دینا پڑتی ہے، ان باتوں کی رعایت کرنے پر بعض وقت بغیر کچھ کہے بھی اثر پڑ جاتا ہے، بعض وقت صاف طریقہ سے بات کہنے کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں بڑا صبر کرنا پڑتا ہے اور نصیحت کرنے پر سخت وسست بھی سننا پڑتا ہے اور اس کو جھیلنا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ کام مشکل اور مجاہدہ کا کام بن جاتا ہے، لیکن اس کے لیے جو اجر بیان کیا گیا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خوشنودی حاصل ہوتی ہے، اس کا دھیان کرنے پر ساری زحمت کافور ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کو خیر وصلاح کی طرف دعوت دینے میں اتنی زحمت وحکمت کی ضرورت نہیں ہوتی جتنی غیر مسلموں کو حق کی راہ پر لانے میں ہوتی ہے، وہاں اس کام میں زیادہ حکمت عملی، خوش اخلاقی اور موقع محل کے لحاظ کی ضرورت ہوتی ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے نو سو پچاس سال محنت کی اور توجہ وبرداشت کے ساتھ کام میں لگے رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دہائی سے زیادہ وقت اس کام میں صرف کیا، طرح طرح کی ایذا رسانی برداشت کرنا پڑی، لیکن بہت دردمندی اور بردباری کے ساتھ کام میں لگے رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر گندگی پھینکی گئی اور آپ مشتعل نہیں ہوئے، آپ کو پاگل، جادوگر اور مفسد کہا جاتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبر وسکون کے ساتھ سب سنتے اور نظر انداز کرتے، پھر مستزاد یہ کہ کہنے والے خاندان کے ہی لوگ تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاندانی عزت واثر میں ان کہنے والوں سے کم بھی نہیں تھے، اگر چاہتے تو سخت جواب دیتے اور دانت کھٹے کر دیتے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کی مصلحت کی خاطر برداشت کیا اور جب بھی موقع مناسب پایا، بڑے سے بڑے مخالف سے مل کر بہت خوش اسلوبی سے بات کہی، لیکن آخر میں جب ان عزیز واقارب نے مکہ میں آپ کا رہنا مشکل بنا دیا تو اپنے پروردگار کی اجازت وحکم سے ہجرت فرمائی اور مکہ چھوڑتے ہوئے وطن عزیز کو خیر باد کہنے کا جو اثر طبیعت پر ہوتا ہے وہ برداشت کیا، جو آپ کے اس جملہ سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ نے وطن چھوڑتے ہوئے فرمایا کہ اے مکہ! ہم تم کو نا چھوڑتے، لیکن تمہارے رہنے والوں نے ہم کو رہنے نہیں دیا۔ مکہ آپ کا وطن ہی نہ تھا، بلکہ کعبہ کی وجہ سے قلب ودماغ کا مرکز بھی تھا، لیکن دعوت دین کی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو چھوڑا، کوئی کش مکش نہیں کی اور نہ انتقام لینے کو سوچا، کیوں کہ اس سے دعوت کا کام متاثر ہوتا، پھر مدینہ جا کر چند برس کی جدوجہد کے بعد صلح حدیبیہ یعنی نفس کشی کا کام کیا، تا کہ دشمنوں کی دشمنی کچھ دنوں کے لیے موقوف کر سکیں اور اس طرح مسلمان دین کی دعوت پرسکون اور آپسی ہمدردی کے ماحول میں پیش کر سکیں، چناں چہ اس کا غیر معمولی اثر پڑا کہ ان دو سالوں میں جتنے لوگ مسلمان ہوئے وہ اس سے قبل کی ساری مدت میں مسلمان ہونے والوں سے زیادہ تھے۔

جب معاشرہ مشترک طرز زندگی کا ہو اور اقتدار اور حکومت کا اس سلسلہ میں مفید کردار ہو تو صرف محبت وہمدردی اور دل سوزی ہی ذریعہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی اعلیٰ مثالیں ہیں، حق سے روگرداں لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو سرے سے مذہب ہی کو نہیں مانتے، جن کو دینی اصطلاح میں ملحد کہا جاتا ہے، ان کو حق کی طرف مائل کرنے کے لیے مذہب کی خوبیوں اور برکتوں اور نعمتوں سے روشناس کرانا ہوتا ہے، ان کو بتانا ہوتا ہے کہ بے مذہب بے خدا ہونے کی صورت میں زندگی کس قدر خشک اور بے مزہ ہو جاتی ہے اور سکون قلب سے کس قدر دور ہوتی ہے

ملحد کو ترغیب دینا ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے تسکین بخش ہونے کی صفت کا تجربہ کر کے تو دیکھیں، ذرا اس کو سمجھنے کی تو کوشش کریں، دوسری طرح کے روگرداں اشخاص وہ ہوتے ہیں جو مذہب کو تو مانتے ہیں اور خدا کو بھی مانتے ہیں، لیکن راہ حق و دین صحیح سے منحرف ہوتے ہیں، وہ آخری نبی اور آخری دین کو نہ جاننے کی وجہ سے ان کو مانتے نہیں ہیں، خدائے واحد پر انحصار ان کے مذہب میں نہیں ہوتا، ایسے اشخاص کو دین حق سے قریب لانے کی ضرورت ہوتی ہے، تا کہ وہ قریب ہو کر دین حق کا، توحید و رسالت کا مطالعہ کر سکیں اور اس کی خوبی سمجھ سکیں، ایسے اشخاص کے ساتھ محبت سے پیش آنا ہوتا ہے او رحسن سیرت سے ان کو اپنے سے قریب کرنا ہوتا ہے، ان کو ایمان کی بات بتانا ہوتی ہے، ایمان کی دعوت دینا ہوتی ہے، ایمان وہ جملۂ حق ہے جو ہر مذہب کا ماننے والا سنتا اور دھیان دیتا ہے، اس کے لیے کسی بھی شخص سے ایمان کے حوالہ سے بات کی جاسکتی ہے، وہ اس کو آسانی سے سنے گا اور اگر اس کے دل کو یہ بات چھوگئی تو اس سے متاثر ہوگا، ایمان کا تعلق دل سے ہے، دلائل و حجت کا تعلق عقل سے ہے، عقل خوب پینترے جانتی ہے، اس کو شکست دینا آسان نہیں ہوتا، لیکن دل کو جب بات اچھی لگ جائے تو دل مائل ہو جاتا ہے، وہ دلائل کے چکر میں زیادہ نہیں پڑتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کفار کے سامنے بات رکھی تو خالق اور پروردگار کو ایک ماننے کی بات رکھی اور اسی کے ساتھ انسانوں کے ساتھ ہمدردی، مظلوموں کی مدد، مہمان کی خاطر داری، مسافر کی مدد جیسے کاموں کی تلقین کی اور اس کی دعوت دی، یہ حکمت اور طریقہ تھا جو دلوں کو جلدی متاثر کرتا ہے، غیر مسلموں کو قریب کرنے کے لیے اس کی نقل کی جاسکتی ہے، ہمدردی و انسانیت نوازی اور ایمان باللہ و بالرسول و خاتم المرسلین کو ملانے سے وہ عظیم دعوت بن جاتی ہے، جس میں ایک خاص برکت اور تاثیر ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلمکی ایک سنت کی پیروی ہے، جو آپ نے مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران اختیار فرمائی تھی، آپ کو ایذائیں دی گئیں لیکن آپ نے صبر کیا، سخت سست کہا گیا لیکن آپ نے برداشت کیا اور اخلاق و محبت کے ساتھ، ہمدردی اور حکمت کے ساتھ کام جاری رکھا اور ایک ایک کر کے لوگوں متاثر ہوتے گئے اور جس نے اثر لیا وہ آپ کا گرویدہ ہو گیا، دراصل دعوت کے کام میں مدعو کے دل پر اثر کرنے والی بات کی ضرورت ہوتی ہے، اپنے کو اس کا خیر خواہ اور مخلص محسوس کرانے کی ضرورت ہوتی ہے، کیوں کہ انسان اپنے مخلص و خیر خواہ کی بات سنتا ہے اور جس کو وہ مخلص و خیر خواہ نہ سمجھے اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام کے سلسلہ میں جو ہدایات یا وضاحتیں فرمائی ہیں، ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کام خیر خواہی کے جذبہ کے بغیر نہیں ہوسکتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خیر خواہی اتنی محسوس کرائی کہ حیرت ہو جاتی ہے، عبداللہ بن ابی اپنے قبیلہ خزرج کا بڑا مقبول سردار رہ چکا تھا، قبیلہ کے ساتھ وہ بھی اسلام لایا، لیکن اسلام اس کے حلق سے نہیں اترا تھا، وہ اپنے کو مسلمان ثابت کرتا، لیکن اندر اندر دشمنی کرتا، ظاہر میں مسلمان ہو گیا تھا، اس لیے اس کا قبیلہ اس سے ہمدردی رکھتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی رعایت میں یہ جانتے ہوئے کہ وہ منافق ہے بلکہ اس کی طرف سے آپ کو وقتاً فوقتاً سخت ایذا پہنچتی تھی لیکن اچھا برتاؤ رکھا، بلکہ ایک سفر کے دوران عبداللہ بن ابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کی طرف آتے ہوئے مسلمانوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ مدینہ پہنچ کر مدینہ کے معزز لوگ ان گھٹیا اور ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے، جس کا صاف مطلب تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مہاجرین کے لیے وہ کہہ رہا تھا، یہ ایسی بات تھی کہ خود عبداللہ بن ابی کے بیٹے کو بری لگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس باغیانہ حرکت پر ان کے باپ کو

سخت سے سخت سزا دے سکتے ہیں، یا خود مسلمان ناراض ہوکر اس کو قتل کر سکتے ہیں، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے باپ نے ایسی گندی بات کہی ہے، اس پر وہ لائقِ قتل ہو سکتے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ قتل کا کام اگر کوئی مسلمان کرے گا تو میں انسان ہوں، فرزند ہونے کے ناطہ مجھ پر اثر پڑ سکتا ہے، جو میرے ایمان کے لیے مضر ہوگا، لہٰذا یہ کام لینا ہو تو مجھ سے ہی لے لیجیے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، بلکہ میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کا ایسا اثر پڑا کہ جب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا یہ قافلہ داخل ہوا تو عبداللہ بن ابی کے بیٹے راستہ پر کھڑے ہو گئے اور باپ کی آمد پر تلوار دکھا کہا، سن لیجیے، معزز و مؤقر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان ہیں اور ذلیل اور پست آپ ہیں، اب سن لیجیے! آپ مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر داخل بھی نہیں ہو سکتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وعدہ کو برابر نبھایا کہ عبداللہ بن ابی کے ساتھ تاحیات خوش اخلاقی کا ہی معاملہ رکھا، خوش اخلاقی اختیار کرنے کے سلسلہ میں قرآن کی ہدایت یہاں تک آئی کہ اگر کوئی مشرک تمہاری حفاظت میں آئے تو اس کو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس ٹھہراؤ، اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلام سنے گا، پھر اس کو اس کی حفاظت کی جگہ تک پہنچا دو۔

صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین نے دعوتِ دین کی خاطر احکام خداوندی اور اسوۂ نبوت کو پوری طرح اختیار کیا، اسی کا اثر ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد ہے، اس سلسلہ میں ان کے بے شمار واقعات ہیں، جن سے ان کی محنت، صبر و برداشت، عام انسانی ہمدردی و خیر خواہی، دوستوں کے ساتھ اخلاص و محبت، دشمنوں کے ساتھ بھی عافیت و خیر بن جاتی ہے، چناں چہ ایک شاعر نے کہا ہے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

یہ خوش آئند بات ہے کہ برصغیر میں الحمدللہ دعوت کے کام میں اب بھی مسلمانوں کی ایک تعداد مصروف ہے، ان کے میدانِ عمل اور طریقۂ کار میں تنوع ہے، ان کے ذریعہ دین کے تعارف، ایمان و عملِ صالح کی تلقین کا کام انجام دیا جا رہا ہے، محبت و ہمدردی کے ساتھ لوگوں سے ملتے اور بے غرض رویہ کے ساتھ کام کرتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے کام کے اثرات بھی غیر معمولی ظاہر ہو رہے ہیں، نہ معلوم کتنے ایسے افراد ہیں کہ دعوت کے ان تک پہنچنے سے قبل مختلف قسم کے حرام کاموں میں اور خدا بیزاری زندگی میں مبتلا تھے، وہ دعوت کا اثر قبول کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ نہایت صالح مسلمان بنے، بلکہ پرہمت اور منہمک داعی بنے ہوئے ہیں، لاکھوں آدمی جو آزادانہ زندگی میں مبتلا رہ چکے ہیں وہ اب دیکھنے میں مولوی جیسے معلوم ہوتے ہیں اور عملی طور پر دینی زندگی میں سرشار نظر آتے ہیں۔

یہ سب نتیجہ ہے دعوتی زندگی اختیار کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کے حکم ودعوت کی تعمیل کا، اللہ تعالیٰ نے چاہا تو دعوت کی یہ کوششیں جو بے غرض طریقہ سے جاری ہیں خواہ جماعت تبلیغ کی ہوں، خواہ دوسرے دعوتی عمل رکھنے والی جماعتوں کی ہوں، امت مسلمہ کی حفاظت و ترقی کے بہترین نتائج پیدا کریں گی اور کم از کم اس امت کے بقا و تحفظ کا ذریعہ ثابت ہوں گی۔

ہم سب کو اس کی اہمیت سمجھنا اور حسب استطاعت اس میں حصہ لینا چاہیے، یہی ہمارے لیے، جو کہ خیر امت کہلاتے ہیں، کام یابی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے اور قبول فرمائے۔

☆☆☆